۲۱

میاں عزیز احمد صاحب مرحوم سے متعلق اپنوں کے خیالات اور معاندین کے اعتراضات

(فرمودہ ۸؍جولائی ۱۹۳۸ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

''مَیں گزشتہ خطبات کے سلسلہ میں اب وہ اعتراضات لیتا ہوں جو ہمارے اندر سے بعض نکل جانے والے آدمیوں کی طرف سے یا ان کے بھائی احرار کی طرف سے اپنے خطبوں یا پرائیویٹ مجالس میں بیان کئے گئے ہیں۔

ان دو اعتراضوں میں سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے میاں عزیز احمد صاحب کی مدد نہیں کی حالانکہ ان کے مقدمات پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ وہ غریب آدمی ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل تک مقدمہ کیونکر لڑ سکتا تھا، گویا یہ جو مرکز کی طرف سے کہا گیا ہے کہ ہم نے میاں عزیز احمد صاحب کی مدد نہیں کی یہ درست نہیں ورنہ ہائیکورٹ اور پریوی کونسل تک مقدمہ میاں عزیز احمد صاحب جیسا غریب آدمی کیونکر لڑ سکتا تھا۔

پہلے تو میں اصولی طور پر اس امر کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی شخص کا جُرم انکشاف کے بعد ثابت ہوتا ہے نہ کہ پہلے۔ خالی الزام کسی کے جُرم کو ثابت نہیں کیا کرتا۔ (میں زیادہ تر

اس مضمون میں اصول کے لحاظ سے ہی بحث کروں گا کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے کارآمد ہوتے ہیں ورنہ اعتراض تو لوگ کرتے رہتے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے) تو رائج شدہ اصل دنیا میں یہی ہے اور یہ اسلام کا اور باقی تمام مذاہب کا بھی مسلّمہ اصل ہے اگر بعض مسلمان کہلانے والے یا یہودیت کو سچا سمجھنے والے یا عیسائیت کو اختیار کرنے والے غلطی کریں تو یہ اور بات ہے ورنہ قومی طور پر یہی مسلّمہ اصل ہے کہ محض الزام لگا دینا کسی جُرم کے ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ ہاں جب ثبوت مہیا کیا جائے اور جب انسان ان شواہد کو دیکھ کر یہ قطعی نتیجہ نکالے کہ اب جُرم ثابت ہو گیا ہے تو پھر اس کا حق ہے کہ ملزم کو مجرم کہے اس سے پہلے وہ مجرم نہیں ہوتا۔

تو جُرم انکشافِ حقیقت کے بعد ثابت ہوتا ہے چاہے یہ انکشاف عدالت میں مقدمہ کئے جانے کے بعد ہو۔ یعنی کوئی باقاعدہ عدالت اس مقدمہ کو سُنے اور پھر فیصلہ کر دے۔ کہ اب جُرم ثابت ہو گیا ہے اور چاہے ذہنی اور عقلی طور پر کوئی شخص مختلف امور پر غور کر کے ایک نتیجہ قائم کر دے کیونکہ ہر انسان کے اندر خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ، خدا تعالیٰ نے ججی کی قابلیت رکھی ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ انسانی آنکھوں کے سامنے سے کوئی چیز گزرے یا کسی اور حِس کے ذریعہ سے ایک امر کا اسے علم ہو اور اس کے متعلق انسان کوئی فیصلہ نہ کرے۔ پس چونکہ ہر انسان جج ہے اس لئے اگر پورے طور پر سوچنے اور غور کرنے کے بعد کسی شخص پر انکشافِ حقیقت ہو جائے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں مجرم ہے لیکن بہر حال جُرم انکشاف کے بعد ثابت ہو گا نہ کہ پہلے۔ اگر جُرم محض مقدمہ دائر کر دینے سے ثابت ہو جاتا ہو تو پھر ہر وہ وکیل جو مدعا علیہ کی طرف سے پیش ہوتا ہے، مجرم اور گنہگار رہے کیونکہ وہ مجرم کی امداد کرتا ہے لیکن یہ اصل دنیا میں رائج ہو جائے تو پھر خود ہی سوچو کہاں امن باقی رہ سکتا ہے۔ اس قسم کا اعتراض کرنے والے چونکہ نہ صرف عام مسلمان ہیں بلکہ بعض احمدی کہلانے والے بھی ہیں اس لئے میں انہیں سمجھانے کے لئے کہتا ہوں کہ فرض کرو کسی جگہ احمدی یا اسلامی حکومت قائم ہو اور وہاں یہ قانون نافذ ہو کہ ملزم کی طرف سے پیش ہونے والا وکیل گنہگار ہوتا ہے تو کیا ایسی حکومت سے لوگ ایک دن بھی خوش رہ سکتے ہیں اور کیا ایسی حکومت دنیا میں امن قائم کر سکتی ہے۔ آخر عدالت میں مقدمہ تبھی آئے گا جب کسی پر الزام لگے گا کہ اس نے فلاں خلافِ قانون

فعل کا ارتکاب کیا ہے۔اب اگر الزام کے لگنے کے ساتھ ہی وہ مجرم بھی بن جاتا ہے تو لازماً ہر وہ وکیل جو اس کی طرف سے عدالت میں پیش ہوگا گنہگار ہوگا۔اب تم ایسی گورنمنٹ فرض کر کے خود ہی سوچ لو کہ کیا اس سے امن قائم ہو جائے گا یا فساد ہی فساد بڑھتا چلا جائے گا۔فرض کرو تم ایک دن خاموشی کے ساتھ بازار سے گزر رہے ہو اور کوئی بدمعاش دکاندار تمہیں سادہ لوح سمجھ کر شور مچا دیتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ تم نے اس کی دکان سے مال اٹھایا ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ ڈر کر تم اسے کچھ روپے دے دو مگر تم اسے روپیہ نہیں دیتے اور مقدمہ عدالت میں چلا جاتا ہے۔تو اب بجائے اس کے کہ اس ظلم کا ازالہ کیا جائے جو تم پر کیا گیا ہے اور تمہاری شرافت کی تائید کی جائے اگر اس اصل کے تحت کہ جُرم محض مقدمہ کر دینے سے ثابت ہو جاتا ہے تمہاری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا جائے اور کہنا شروع کر دیا جائے کہ جو وکیل بھی تمہاری طرف سے پیش ہوگا وہ گنہگار ہوگا کیونکہ وہ ایک ملزم کی حمایت کرتا ہے تو کیا یہ درست طریقِ عمل ہوگا اور کیا تمہارا جی چاہے گا کہ یہی اصل تمام دنیا میں رائج ہو جائے۔اور اگر کوئی شخص اپنی نادانی سے سمجھتا ہے کہ اسلام کا یہی منشاء ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اسلام ہر شریف آدمی کی پگڑی اُچھال لینے کی تائید کرتا اور مظلوموں کی امداد کو گناہ قرار دیتا ہے۔

تو کسی ملزم کو مجرم قرار دینا حماقت کی بات ہوتی ہے۔ملزم کے معنی صرف اتنے ہیں کہ اس پر کوئی الزام لگایا گیا ہے، آگے وہ الزام سچا ہے یا جھوٹا، یہ بعد میں ثابت ہوگا۔اسی لئے قانونی طور پر مجرم اَور ہوتا ہے اور ملزم اَور، جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوتا۔اور جب اس کے خلاف فیصلہ ہو جاتا ہے تو وہ مجرم ہوتا ہے۔عربی میں بھی یہ دونوں اصطلاحیں رائج ہیں۔چنانچہ ملزم اسے کہتے ہیں جس پر الزام لگایا گیا ہو اور مجرم اسے کہتے ہیں جس کے متعلق کسی جُرم کا اثبات ہو چکا ہو۔تو جب تک عدالت مقدمہ کا فیصلہ نہیں کرتی یا کسی اور ذریعہ سے انکشافِ حقیقت نہیں ہوتا اس وقت تک ملزم مجرم نہیں ہوسکتا۔اور جس کی مدد سے اسلام روکتا ہے اور جس کی تائید سے ہر شریف آدمی بچتا ہے اور وہ ملزم نہیں بلکہ مجرم ہے۔اگر ملزموں کی مدد سے اسلام روکتا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مظلوموں کی مدد کرنے سے روکتا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔

یہ تو اصولی جواب ہے جو میں نے دیا۔لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ معترض اپنے گھر کی بات بھی تو

بیان کریں۔کیا ان کے آدمیوں پر جب مقدمات دائر ہوتے ہیں وہ ان کی مدد کرتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً مولوی عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری پر اس وجہ سے مقدمہ ہؤا کہ انہوں نے بانی سلسلہ احمدیہ اور جماعت احمدیہ کو اپنی تقریر میں گالیاں دی تھیں۔

اب گالیاں دینا اپنی ذات میں ایک جُرم ہے۔اخلاقی طور پر بھی اور مذہبی طور پر بھی اور قانونی طور پر بھی لیکن جب وہ مقدمہ ہؤا احرار نے ان کے لئے چندے بھی جمع کئے، وہ وکیل بھی لائے اور وہ جمع ہو کر اور پارٹیاں بن بن کر عدالتوں میں بھی جاتے رہے۔اب سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔اگر کسی ملزم کی مدد کرنا گناہ ہے تو یہ گناہ خود ان کے گھروں میں بھی ہوتا چلا آیا ہے اور جو مقدمات احرار پر ہوئے ہیں ان سب میں ان کی طرف سے ڈیفنس پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے چندے بھی اکٹھے کئے ہیں۔انہوں نے مدد کے لئے بھی لوگوں سے اپیلیں کی ہیں اور سب نے قومی طور پر ان میں حصہ لیا ہے مگر ہماری طرف سے کبھی ان پر یہ اعتراض نہیں کیا گیا کہ وہ ملزم کی کیوں امداد کرتے ہیں؟ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ اس حصہ میں ہم ملزم کو مجرم نہیں سمجھتے۔تو پھر اگر کوئی دوسرا بھی ملزم کی کسی ایسی بات میں مدد کرتا ہے جس میں وہ اسے مجرم نہیں سمجھتا تو اس پر انہیں اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ بلکہ مشتبہ بات تو الگ رہی ایسے کیسز موجود ہیں جن میں جُرم نہایت واضح تھا اور شُبہ والی کوئی بات نہیں تھی مگر پھر بھی ان کی مدد کی گئی۔مثلاً میاں عبدالرشید دہلوی نے جب شردھانند جی پر حملہ کیا۔یا میاں علم الدین لاہوری نے لاہور کے ایک ہندو مصنف پر حملہ کیا۔یا میاں عبدالکریم نے کراچی میں ایک ہندو یا سکھ پر (مجھے صحیح یاد نہیں) حملہ کیا۔تو تمام مسلمانوں نے ان کے لئے چندے بھی کئے،ان کی طرف سے وکیل بھی مقرر کئے گئے اور ان کی ہر رنگ میں امداد بھی کی۔حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان میں سے دو اقراری مُجرم تھے اور وہ کہتے تھے کہ ہم نے واقع میں قتل کیا ہے اور جب وہ اقراری مجرم تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے ان کی امداد کی۔

پس بفرضِ محال اگر یہ اعتراض سچا بھی ہو (ابھی میں اس اعتراض کو تسلیم نہیں کر رہا۔ میں صرف فرض کے طور پر امکانی رنگ میں یہ گفتگو کر رہا ہوں) اور فرض کرلو کہ جماعت نے میاں عزیز احمد صاحب کی مدد کی اور اس مدد کے معنے یہ تھے کہ ہم نے قتل پر انگیخت کی تو پھر ماننا

پڑے گا کہ احرار اور مسلمانوں نے بھی میاں عبد الرشید دہلوی، میاں علم دین لاہوری اور میاں عبدالکریم کراچی والے کی مدد کر کے قتل پر انگیخت کی ہے۔ آخر یہ ایسے ہی مقدمات تھے جیسے میاں عزیز احمد پر مقدمہ دائر ہؤا۔ پھر جب ان مقدمات کے دوران میں انہوں نے ملزمین کی مدد کی ہے، ان کے لئے لوگوں سے چندے لئے ہیں اور ان کے مقدمات کی پیروی کے لئے اپنے میں سے وکیل مقرر کئے ہیں اور اس کے معنی قتل کی انگیخت کے ہوتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ اس جُرم کا ارتکاب وہ بھی کرتے رہے ہیں۔ پس جو کام وہ خود بھی کرتے رہے ہیں اگر اسی قسم کا کام بفرضِ محال کوئی دوسرا بھی کر لے تو اس پر انہیں اعتراض کا کیا حق ہے مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے محض الزام سے ملزم مجرم نہیں بن جاتا۔

اسی اصل کے ماتحت اب میں وہ حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں جس کے بعد ہر منصف مزاج شخص یہ سمجھ جائے گا کہ یہ اعتراض کس قدر غلط ہے۔ جس وقت یہ واقعہ رونما ہؤا ہے اور اس کی ہمیں پہلے پہلے اطلاع ملی ہے تو وہ ایسی شکل میں تھی جس سے اندازہ یہ کیا گیا کہ یہ ایک باہمی لڑائی تھی جس میں غالبًا حملہ میاں فخر الدین صاحب کی پارٹی نے کیا تھا اور اس کی بناء بعض ایسے گواہوں کی شہادت پر تھی جنہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے پہلے دو شخصوں کو میاں عزیز احمد صاحب پر حملہ کرتے دیکھا جس کے بعد انہوں نے اُٹھ کر ان میں سے ایک پر حملہ کیا۔ (اس کی تشریح اخبار الفضل ۲۰؍اگست ۱۹۳۷ء میں ہو چکی ہے) اس صورت میں ہم سمجھتے ہیں کہ میاں عزیز احمد صاحب پر قتل کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ غلط ہے اور لازمی طور پر ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے آدمی کی مدد کرتے جب بعض افراد ایک جماعت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی جماعت کو بچانے کے لئے ہر جائز کوشش کریں۔ پس بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا اور بحیثیت ناظر ہونے کے ناظروں کا اور بحیثیت پریذیڈنٹ ہونے کے پریذیڈنٹوں کا اور بحیثیت سیکرٹری یا کوئی اور عہدیدار ہونے کے سیکرٹریوں اور باقی تمام عہدیداروں اور بحیثیت احمدی ہونے کے ہر احمدی کا فرض ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ کوئی احمدی کسی ایسے الزام میں مأخوذ ہے جو درست نہیں تو اس کی ہر جائز اور ممکن امداد کرے۔

پس اس وقت بحیثیتِ جماعت ان کی امداد کا فیصلہ کیا گیا۔ یعنی وکلاء کو ناظروں نے بلایا اور

ان سے مشورہ لیا اور انہیں مناسب ہدایتیں دیں۔ غالباً مرزا عبدالحق صاحب اور مولوی فضل الدین صاحب وکیل سے کہا گیا کہ وہ لوگوں سے گواہیاں لیں چنانچہ انہوں نے مقدمہ کی تیاری شروع کردی لیکن دو تین دن کے بعد جبکہ مختلف بیانات اکٹھے ہوئے اور ان کا مجھ سے ذکر کیا گیا تو مختلف شہادتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمارا پہلا علم غلط فہمی پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میاں عزیز احمد صاحب کی طرف سے پہلا حملہ ہوا ہے، دفاع نہیں ہوا۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میری طرف سے اسی وقت ہدایت کر دی گئی کہ جماعت اس بارہ میں بحیثیت جماعت ان کی مدد نہ کرے۔ چنانچہ مرکز سلسلہ نے اپنی مدد واپس لے لی۔

درحقیقت مرزا عبدالحق صاحب نے جب مختلف بیانات آکر مجھے سنائے تو اس وقت میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلا حملہ میاں عزیز احمد صاحب پر نہیں بلکہ میاں فخر الدین صاحب پر تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں کہہ دیا کہ اس تحقیق کے بعد ہمارا حق نہیں کہ ہم ملزم کی براءت ثابت کریں۔ مرزا صاحب میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہی تھے کہ چند منٹ بعد ناظر صاحب امورِ عامہ آئے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میاں بشیر احمد صاحب کا خیال ہے کہ اس وقت تک جس نتیجہ پر ہمارے دوست پہنچے ہیں وہ غلط ہے کیونکہ بعد میں بعض گواہیاں ایسی ملی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا حملہ میاں عزیز احمد صاحب نے کیا ہے۔ اس پر میں نے انہیں بتایا کہ ابھی ابھی میں بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں اور میں ہدایت دے چکا ہوں کہ ہماری طرف سے جماعتی طور پر ان کے لئے کوئی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی؟ اس کے متعلق پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اصل بات یہ ہوئی کہ لڑائی دو جگہ پر ہوئی تھی۔ یعنی پہلے بازار کے اُس حصہ میں جہاں نسبتاً ہندو، سکھ اور غیر احمدی دکاندار زیادہ ہیں اور یہاں میاں عزیز احمد صاحب نے پہلا حملہ کیا پھر چند گز ہَٹ کر اس جگہ پر جہاں احمدی دکاندار زیادہ ہیں۔ یہاں میاں فخر الدین صاحب کے ساتھیوں نے ہاکی مار کر اسے گرایا اور چوٹیں کھانے کے بعد میاں عزیز احمد صاحب نے مدافعانہ حملہ کیا۔

پس وہ گواہ جن کی گواہی سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ پہلا حملہ میاں عزیز احمد صاحب نے نہیں کیا

بلکہ میاں فخر الدین صاحب کے ساتھیوں نے کیا ہے۔اس وقوعہ کے گواہ تھے جو ان کی دکانوں کے سامنے پہلے حملہ کے بعد ہؤا تھا۔اس جگہ یہی نظر آتا تھا کہ میاں عزیز احمد صاحب بھاگ رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے میاں فخر الدین صاحب کے ساتھی ہاکی اٹھائے دوڑ رہے ہیں اور اس جگہ کی گواہی واقعی یہ ثابت کرتی ہے کہ ان کا حملہ صرف مدافعانہ تھا اور اس میں کوئی جھوٹ نہ تھا۔مگر دوسری طرف ہندو اور سکھ گواہوں میں سے بعض ایسے تھے جن کی گواہی کو کُلّی طور پر رَدّ نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان کا یہ بیان تھا کہ بازار کے شروع میں پہلے میاں عزیز احمد صاحب نے حملہ کیا ہے۔پس جب یہ دونوں حصے مل گئے تب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی کہ پہلا حملہ میاں فخر الدین صاحب پر تھا اور اس کے بعد دوسرا تتمہ وہ لڑائی تھی جو چند گز ہَٹ کر ہوئی۔بہرحال جب ہماری غلط فہمی دور ہوگئی اور اصل حقیقت ہم پر واضح ہوگئی تو میں نے اسی وقت سلسلہ کے ذمہ دار ارکان سے کہہ دیا کہ اس صورت میں میاں عزیز احمد صاحب کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔دوسری طرف میں نے میاں عزیز احمد صاحب کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ ہماری تحقیق یہی ہے کہ تمہاری طرف سے پہلا حملہ ہؤا اور اگر تمہارا علم بھی یہی کہتا ہے تو تمہیں کم سے کم اپنی عاقبت خراب نہیں کرنی چاہئے اور جو سچی بات ہے اس کا اقرار کر لینا چاہئے کیونکہ جسم کی حفاظت کی نسبت ایمان کی حفاظت زیادہ مقدم ہے۔اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس دن مسٹر انز ڈپٹی کمشنر گورداسپور یہاں آئے ہوئے تھے۔انہوں نے دورانِ گفتگو میں خان صاحب مولوی فرزند علی صاحب سے ذکر کیا کہ مخالفینِ احمدیت کہتے ہیں جماعت احمدیہ اب اسے قومی ہیرو بنا دے گی اور اس طرح دوسرے نوجوانوں میں قتل کے جذبات پیدا ہو جائیں گے اس لئے ہم یہ خواہش کرتے ہیں کہ قومی طور پر جماعت اس مقدمہ میں حصہ نہ لے۔خان صاحب فرزند علی صاحب اس وقت ناظر امور عامہ نہیں تھے انہوں نے جب مجھ سے اس کا ذکر کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ مجھے جس وقت سے اس بات کا علم ہؤا ہے کہ پہلا حملہ میاں عزیز احمد صاحب نے کیا ہے میں نے اسی وقت یہ ہدایت کر دی ہے کہ جماعت بحیثیت جماعت اس کی کوئی مدد نہ کرے اور اسے بھی نصیحت کر دی ہے کہ جو کچھ سچی بات ہے وہ بلاکم وکاست بیان کر دے۔آج اس کی پیشی ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ اگر وہ سچا احمدی ہے تو وہ ضرور اپنے جُرم کا اقرار کرے گا۔چنانچہ اتفاق کی

بات یہ ہے کہ جس وقت ڈپٹی کمشنر صاحب کہہ رہے تھے کہ جماعت اب اسے قومی ہیرو بنا دے گی ۔عین اُسی وقت کمرۂ عدالت میں میاں عزیز احمد صاحب یہ بیان دے رہے تھے کہ میں نے خود میاں فخر الدین صاحب کے پوسٹر کی وجہ سے اشتعال میں آ کر ان پر حملہ کیا ہے۔ جب اس قسم کی حرکت قاضی محمد علی صاحب سے ہوئی تھی اُس وقت میں نے بھی انہیں یہی نصیحت کی تھی کہ اگر آپ سے پہلے کوئی قصور ہؤا ہے تو اس کا اقرار کر لیں ۔اس کے مقابلہ میں ذرا یہ معترض بھی بتائیں کہ ان کے آدمی کس طرح اقرار کیا کرتے ہیں ۔ان کی طرف سے اکثر مقدمات میں واقعات کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر جھوٹے گواہ عدالت میں پیش کئے جاتے ہیں مگر احمدی کیسز میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں واقعات کو چھپانے اور اصلیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو یہ واقعہ بھی ایک ایسے بازار میں ہوتا ہے جس میں کثرت سے احمدیوں کی دکانیں ہیں مگر ایک احمدی بھی جھوٹی گواہی نہیں دیتا ۔کیا یہ سلسلہ احمدیہ کی سچائی کا ثبوت نہیں ۔اگر دوسرے لوگ مقدمات میں جھوٹ بول سکتے ہیں تو کیا احمدی اگر ان میں ایمان نہ ہوتا جھوٹ نہیں بول سکتے تھے ۔وہ بھی بول سکتے تھے مگر اسی ایمان نے انہیں جھوٹ بولنے سے باز رکھا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے ۔

پس یہ واقعہ بذات خود جماعت احمدیہ کی راستبازی کا ایک ثبوت ہے ۔اور اس واقعہ نے اور اسی قسم کے بعض اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر احمدی جھوٹ بولنے والے ہوتے تو مقدمات ضرور مشتبہ ہو جاتے ۔مگر آج تک جتنے مقدمات میں ہماری جماعت کے افراد کو بظاہر نقصان پہنچا ہے، محض جُرم کا اقرار کرنے اور سچ بولنے کی وجہ سے پہنچا ہے ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ قاضی محمد علی صاحب پر جن دنوں مقدمہ چل رہا تھا، ایک افسر سے ایک احمدی نے اس کا ذکر کیا اور اس نے دریافت کیا کہ کیا ان حالات میں وہ پھانسی کا مستحق ہے ۔اس افسر نے جواب دیا کہ اگر وہ انکار کرتے تو ان حالات میں پھانسی کیا وہ تو شاید کسی سزا کے بھی مستحق نہ ہوتے ۔مگر جو شخص خود اقرار کر لے اور کہے کہ میں نے قتل کیا ہے، اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے ۔تو احمدیہ جماعت کی سچائی ہی ہے جس نے دشمنوں کے لئے ایک فتح کی صورت پیدا کی اور وہ ہماری جماعت کے بعض افراد کو سزا دلوانے میں کامیاب ہو گئے ورنہ اور کسی صورت میں وہ سزا

نہیں دلوا سکتے تھے۔غرض ایک طرف مرکز سلسلہ نے اپنی مدد واپس لے لی اور دوسری طرف انہیں نصیحت کر دی گئی کہ وہ سچائی کو نہ چھوڑیں اور اگر یہ قصور ان سے سرزد ہؤا ہے تو اس کا اقرار کرلیں۔ بلکہ مزید غلط فہمی دور کرنے کے لئے چونکہ مرزا عبد الحق صاحب اکثر سلسلہ کے مقدمات لڑتے ہیں ان کو بھی روک دیا گیا۔صرف یہ ہدایت دے دی گئی کہ وہ حالاتِ مقدمہ کی نگرانی رکھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ مقدمات میں کوئی ایسی بات تو نہیں کی جاتی جو سلسلہ کی بدنامی کا موجب ہو تا کہ دشمنوں کی شرارتوں کا علم رہے اس سے زیادہ اس مقدمہ میں جماعت نے کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ سلسلہ کی کوششیں محدود رہیں۔

اسی عرصہ میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں حکومت کی طرف سے شکایت ہوئی کہ احمدیت کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ جماعت احمدیہ اسے قومی ہیرو بنا دے گی اور یہ کہنے لگ جائے گی کہ وہ بڑا نیک، بڑا قربانی والا اور سلسلہ کا بڑا خدمت گزار تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے نوجوانوں کے دلوں میں بھی یہی خیال پیدا ہوگا کہ آؤ ہم بھی کسی کو قتل کریں اور شہادت کا درجہ پائیں۔

چنانچہ خان صاحب مولوی فرزند علی صاحب سے ڈپٹی کمشنر صاحب نے خواہش کی کہ آپ اس مقدمہ میں قومی طور پر حصہ نہ لیں۔ چونکہ ہمارا اپنا بھی یہی فیصلہ تھا اس لئے خان صاحب نے ان سے اقرار کیا کہ ہماری جماعت بحیثیت جماعت اس میں حصہ نہیں لے گی اور کہا کہ ہم آپ کی مشکلات کو سمجھتے ہیں۔ہم پر حقیقت چونکہ کھل چکی ہے اس لئے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جماعت قومی طور پر میاں عزیز احمد صاحب کی مدد نہیں کرے گی۔حکومت کا یہ مطالبہ جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہؤا ناجائز تھا اور ہمارا اس سے یہ اقرار کر لینا بھی کہ ہم بحیثیت جماعت ملزم کی مدد نہیں کریں گے، جیسا کہ میں بعد میں ذکر کروں گا نقصان دہ تھا۔مگر بہر حال ہم نے اقرار کیا اور بعد میں اس سے ہمیں نقصان پہنچا لیکن سلسلہ نے اسے قبول کرلیا۔ یہ مطالبہ نقصان دہ اس لئے تھا کہ ایسے مقدمات میں قتل کے واقعات کو بالعموم سازش کا رنگ دے دیا جاتا ہے اور فریقِ مخالف صرف یہ ثابت نہیں کرتا کہ فلاں نے اسے مارا ہے بلکہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اسے مروایا گیا ہے اور یہ طریق ہمارے ملک میں اتنی کثرت سے رائج ہے کہ انگریز مصنف جو قانون کے ماہر ہیں انہوں نے متعدد مقامات پر

اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں قتل صرف منفرد فعل کی حد تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان قتلوں کو کسی سازش کا نتیجہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ہائی کورٹ میں ایک مقدمے کا فیصلہ ہؤا ہے جس میں یہ سوال درپیش تھا کہ مرنے والے نے بہت سے آدمیوں کا نام لے دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے قتل کرنے میں یہ یہ شریک ہیں۔ پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ وہ مرنے والے کے بیان کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اور مقتول مرتے ہوئے جب بھی کسی کا نام لے دیتا اسے ضرور گرفتار کرلیا کرتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ مرنے والا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے حاضر ہونے والا ہوتا ہے۔ وہ مرتے وقت بھلا جھوٹ کس طرح بول سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مقتول مرتے وقت جو بیان بھی دے دیتا۔ اُسے سچا سمجھ لیا جاتا اور اس کے مطابق ملزموں کو سزا دے دی جاتی۔ لیکن آہستہ آہستہ معلوم ہؤا کہ ایسے موقع پر بھی بڑے بڑے جھوٹ بولے جاتے ہیں اور اب عدالتوں کا رُجحان اس طرف ہوگیا ہے کہ ان گواہیوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے تین چار دن ہوئے ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ شائع ہؤا ہے جس میں بڑے بڑے ججوں اور وکلاء کی کتابوں کے حوالہ جات سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ ہندوستان میں کثرت سے یہ رواج ہے کہ مرنے والا بہت سے آدمیوں کے نام لے دیتا ہے کیونکہ اس کے رشتہ دار اُسے کہتے ہیں کہ اب تو تُو مر چلا ہے کوئی بیان ایسا دے جا جس کے نتیجہ میں ہمارے فلاں فلاں دشمن پھنس جائیں چنانچہ وہ ان کے حسبِ منشاء بیان دے دیتا ہے۔

درحقیقت ہمارے ملک کے لوگوں کے دلوں میں یہ ایک غلط خیال بیٹھ چکا ہے کہ مرنے والا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مرتے وقت وہی جھوٹ نہیں بولا کرتا جسے قیامت پر یقین ہوتا ہے مگر جو قیامت اور بعث بعد الموت پر یقین ہی نہ رکھتا ہو وہ اس موقع پر جھوٹ بولنے سے نہیں رہ سکتا بلکہ زیادہ جھوٹ بولتا ہے اور عقلاً بھی یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ اگر اسے خدا کی ہستی پر یقین ہوتا اگر وہ سمجھتا کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے تو اس کی ساری عمر بدکاری میں کیوں گزرتی۔ اس کا تمام عمر بدیاں کرتے چلے جانا بتاتا ہے کہ وہ عالَمِ آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا اور جب وہ دوسرے عالم پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا تو اس کا موت کے وقت

کا بیان کیونکر قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے تو اس قسم کے واقعات ہمارے ملک میں ہوتے رہتے ہیں لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور اس طرح فریقِ مخالف کو پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا مرنے والا بعض آدمیوں کے جُھوٹ مُوٹ کے نام لے دیتا ہے اور اس طرح انہیں پکڑوانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یا پھر پولیس پر یہ زور دیا جاتا ہے کہ یہ منفرد فعل نہیں بلکہ کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ میں بھی سنا گیا ہے ایسا ہی ہؤا اور بیان کیا جاتا ہے کہ میاں فخر الدین صاحب نے مرتے وقت میرا نام بھی لیا۔ سید ولی اللہ شاہ صاحب کا نام بھی لیا اور اسی طرح اور کئی آدمیوں کا نام لیا اور کہا کہ یہ مجھے مروانے والے ہیں۔ اس طرح ان کی پارٹی نے بھی ان مقدمات میں یہ کوشش کی کہ یہ واقعۂ قتل سازش کا نتیجہ ثابت ہو۔

اب قانون انگریزی کی رو سے ایسے فوجداری مقدمات میں ایک طرف گورنمنٹ ہوتی ہے اور دوسری طرف مدعا علیہ اور اگر کسی دوسرے نے کوئی بات اپنی بریت کے لئے پیش کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یا گورنمنٹ کو قابو کرے یا مدعلیہ کی امداد کرے اور اس کے دفاع کے ساتھ اپنا دفاع ملا کر پیش کرے۔ اس کے علاوہ اَور کوئی صورت نہیں ہوتی۔ پس اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یا تو مدعا علیہ سے دوستانہ تعلقات پیدا کرے اور اس ذریعہ سے اپنا ڈیفنس پیش کرے یا حکومت سے دوستانہ تعلقات پیدا کرے۔

یہاں جب مقدمہ شروع ہؤا تو چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ مقدمہ چلایا گیا تھا اس لئے لازمی طور پر دوسری پارٹی جو اصل مدعی تھی اس نے حکومت کی مقامی مشینری سے وابستگی اختیار کی اور چونکہ بعض مقامی پولیس افسر ہمارے دشمن تھے اس لئے خود گورنمنٹ کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ اس میں سازش تھی اور ایسے کئی امور مسل پر آ گئے جن کا سلسلہ پر بُرا اثر پڑتا تھا اور کہا جانے لگا کہ صرف یہی قتل نہیں بلکہ اور لوگ بھی قتل کی اس سازش میں شریک ہیں۔ اب جبکہ حکومت کی طرف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ یہ قتل سازش کا ایک نتیجہ ہے، ہماری جماعت کے لئے اپنی بریت کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ میاں عزیز احمد صاحب کے ڈیفنس میں ایسی باتیں مسل پر لاتی جن سے ان امور کی تردید ہوتی لیکن چونکہ ہم عہد کر چکے تھے کہ ہم میاں عزیز احمد صاحب کی جماعتی طور پر کوئی مدد نہیں کریں گے

اس لئے اس اقرار کے ذریعہ دفاع کا صرف ایک ہی دروازہ جو ہمارے لئے کُھلا تھا وہ ہم نے اپنے اوپر بند کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں مسل پر کئی ایسے امور آگئے جو سلسلہ پر ایک حملہ تھے اور ہمیں دفاع کا کوئی موقع نہ ملا۔ غرض حکومت کا یہ مطالبہ کہ قومی طور پر جماعت احمدیہ اس مقدمہ میں حصہ نہ لے یقیناً ہمارے لئے نقصان دہ تھا کیونکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ایسے مقدمہ میں دو ہی فریق ہوتے ہیں یا حکومت یا ملزم۔ دوسری کسی پارٹی کو خواہ اس کے حقوق پر کس قدر ہی اثر کیوں نہ پڑ رہا ہو براہ راست دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ فریقِ مخالف تو حکومت کے ذریعہ سے اپنا کام کرسکتا تھا کیونکہ وہ حکومت کی طرح مدعی تھا اور اس نے ایسا کیا بھی۔ چنانچہ پراسیکیوشن نے مقدمہ میں زور لگایا کہ یہ سازش کا نتیجہ ہے۔ سلسلہ اگر ایسے حملوں کا دفاع کرسکتا تھا تو محض اسی طور پر کہ وہ مدعا علیہ کی امداد کرتا اور اس کے دفاع کے ساتھ ملا کر اپنا دفاع کرتا لیکن مذکورہ بالا وعدہ کی وجہ سے یہ راستہ سلسلہ کے لئے بند ہو چکا تھا نتیجہ یہ ہؤا کہ ایسے کئی امور جن کا سلسلہ پر بُرا اثر پڑتا تھا مسل پر آگئے لیکن ان کے دفاع کا سلسلہ کو کوئی موقع نہ ملا۔ جھوٹ پھیلتا گیا لیکن اس جھوٹ کا ازالہ نہ ہوسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب جھوٹ اور فریب سے کام لے کر ایک منفرد فعل کو سازش قرار دیا جائے تو قانوناً اور شرعاً ملزم کی مدد کرنے والے کبھی بھی مجرم نہیں کہلا سکتے کیونکہ گو ملزم مجرم ہو مگر جس پر سازش کا الزام لگایا گیا ہے اس کے پاس سوائے اس کے اَور کون سا ذریعہ ہے کہ وہ ملزم کی جائز حد تک امداد کرے اور اس کے دفاع کے ساتھ اپنا دفاع ملا کر مسل پر وہ باتیں لے آئے جن کا لانا ضروری ہے۔ اس صورت میں وہ مجرم نہیں کہلا سکتے کیونکہ انہیں اس کام پر مجبور کرنے والے سازش کا الزام لگانے والے ہوتے ہیں۔ اگر دوسرا فریق ایک بے گناہ جماعت کو موردِ الزام نہ بنائے تو کسی کو کیا ضرورت ہے کہ اس میں دخل دے اور اگر مدعی فریق ایک بے گناہ جماعت کو موردِ الزام بناتا ہے تو اس فریق کے پاس قانونی طور پر سوائے اس کے اَور کونسا ذریعہ ہے کہ وہ ملزم کی مدد کرے اور اس کی مدد کرتے ہوئے اپنا دفاع پیش کردے۔

پس یا تو ہندوستان میں قانون کی اصلاح کی جائے اور ایسے لوگوں کے ذکر کو قطعی طور پر روک دیا جائے جو فریقِ مقدمہ نہیں ہوتے۔ یا پھر انہیں فریق مقدمہ کے طور پر پیش ہونے کی

قانون اجازت دے دے۔ یعنی یا تو یہ قانون کر دیا جائے کہ جو فریقِ مقدمہ نہیں اُس کا مقدمہ کی سماعت کے دوران میں مخالفانہ طور پر ذکر ہی نہ آئے اور یا پھر یہ قانون کر دیا جائے کہ اگر کسی فریق کا اس رنگ میں ذکر آ جائے تو پھر اُس فریق کو حق ہوگا کہ وہ اپنے وکلاء کے ذریعہ مجسٹریٹ کے سامنے اپنا دفاع پیش کرے مگر موجودہ قانون نہ تو ان لوگوں کے مخالفانہ ذکر کو قطعی طور پر روکتا ہے جو فریقِ مقدمہ نہ ہوں اور نہ انہیں فریقِ مقدمہ کے طور پر پیش ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ جیسے مولوی عطاء اللہ صاحب پر جب مقدمہ ہؤا تو ہماری جماعت پر اس مقدمہ کے دوران خطرناک حملے کئے گئے۔ ہم نے گورنمنٹ کو بہتیرا کہا کہ آخر یہ مقدمہ ہم پر تو نہیں چل رہا کہ ہمارے مخالفانہ ذکر کو گورنمنٹ مِسلوں پر لا رہی ہے اس ذکر کو روک لینا چاہئے۔ نہیں تو ہمیں اپنے دفاع کو پیش کرنے کا موقع ملنا چاہئے مگر وہ یہی کہتی کہ کوئی قانون نہیں، کوئی قانون نہیں۔ پس آئندہ یا تو قانون کی یہ اصلاح کی جائے کہ ایسے لوگ جو فریقِ مقدمہ نہیں ان کا مخالفانہ ذکر قطعاً درمیان میں نہ آئے اور یا پھر دوسرے کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنا وکیل لائے اور کہے کہ مجھ پر جب الزام لگاتے ہو تو میرا جواب بھی سن لو۔ اگر یہ دونوں امر نہ ہوں تو جس قدر مذہبی قتل ہندوستان میں ہوں گے ان میں ملزم کی قوم اس بات پر مجبور ہوگی کہ ملزم کا ساتھ دے اور اس کی مدد کرے کیونکہ اس کے ساتھ شامل ہوئے بغیر وہ اپنا دفاع پیش نہیں کرسکتی۔

آخر ایک قوم کی عزت پر جب حملے کئے جائیں اور بلا وجہ اسے لوگوں کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی جائے تو اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے اور عائد کردہ الزامات سے اپنی بریت ثابت کرنے کے لئے کیا طریقِ عمل اختیار کرے؟ اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ ملزم کے ساتھ مل جائے کیونکہ وہ اس کے ساتھ شامل ہوئے بغیر دفاع نہیں کر سکتی۔ وہ قانون جس کا فرض ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے وہ ان حالات میں ظالم کی طرف چلا جاتا ہے اور مقدمہ کی صورت اس طرح بدل جاتی ہے کہ منفرد فعل کو سازش قرار دے دیا جاتا ہے اور جو بالکل بری الذمہ قوم ہوتی ہے اس پر بلا وجہ حملے شروع کر دیئے جاتے ہیں اور اسے اپنی براءت پیش کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا اور وہ اس طرح الگ بیٹھی رہتی ہے جیسے اس پر کوئی

حملہ ہی نہیں ہؤا۔ اور اگر وہ بولتی ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تمہیں اس مقدمہ میں بولنے کا کوئی حق نہیں تم کوئی فریق مقدمہ نہیں کہ اس میں حصہ لے سکو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب وہ فریق مقدمہ نہیں تو مقدمہ میں اس کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ پس اگر کسی مجرم کی مدد کرنا جُرم ہے تو اس کا الزام قانون کے نقص پر آتا ہے نہ کہ اس قوم پر کیونکہ موجودہ قانون اس قوم کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ مجرم سے مل جائے کیونکہ بغیر اس کے وہ اپنا دفاع پیش کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ مگر یہ میں نے عام قانون بتایا ہے کہ ہندوستان میں ایسا ہوتا ہے ورنہ ہماری طرف سے ایسا نہیں ہؤا۔ ہم نے غلطی سے ابتداء میں جب یہ اقرار کیا ہے اُس وقت ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ بعد میں ہمارے ساتھ مخالف پارٹی کے لوگ ایسی شرارت کریں گے کیونکہ ابھی جماعت احمدیہ سے ان کا تعلق قریب ہی میں ٹوٹا تھا اور ہم یہ خیال نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا جھوٹ بولیں گے اور پراسیکیوشن کو ایسے راستہ پر چلائیں گے کہ وہ کہیں گے کہ یہ قتل کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ بعد میں جب ہمیں حالات کے اس طرح بدل جانے کا علم ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ اس مطالبہ کا پورا کرنا ہمارے لئے نقصان دہ ہے تب بھی ہم نے اپنے وعدہ کو کامل طور پر پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ پس اس موقع پر جو بددیانتی ہوئی ہماری طرف سے نہیں ہوئی بلکہ حکومت کے بعض لوکل نمائندوں نے فرض شناسی سے کام نہیں لیا۔

حکومت کی طرف سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسی غیر متعلق باتوں کو قانون کوئی وقعت نہیں دیتا لیکن یہ درست نہیں آخر مسٹر کھوسلہ نے اور کئی مجسٹریٹوں نے پچھلے چند ہی سالوں میں یہ غلطیاں کی ہیں یا نہیں۔ جب ایسی غلطیاں ہوئی ہیں تو لازماً اس قوم کو غصہ آئے گا جس کے اخلاق کو زیرِ بحث تو لایا جاتا ہے مگر اسے دفاع کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حکومت ایک طرف تو ایک ایسی جماعت کا جو فریق مقدمہ نہیں اپنے مقدمات میں بار بار ذکر کرتی ہے، اس کے اخلاق کو زیر بحث لاتی ہے۔ اور اس کے خلاف معاندانہ ریمارکس مِسلوں میں درج کرتی ہے اور پھر کہتی ہے کہ اس کی پرواہ نہ کرو۔ آخر جو چیز ریکارڈ پر آجائے گی، اس کی پرواہ کیوں نہ کی جائے گی۔ وہ شائع بھی ہوسکتی ہے، اس سے استدلال بھی کیا جاسکتا ہے، اسے مخالفانہ رنگ میں پیش بھی کیا جاسکتا ہے پھر جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بھی درست نہیں کہ یہ

غیر متعلق باتیں ہیں جنہیں قانون کوئی وقعت نہیں دیتا۔
اگر حکومت کا یہ قول درست ہے تو وہ بتائے کہ اس نے مسٹر کھوسلہ کو کیا سزا دی تھی۔ کیا مسٹر کھوسلہ نے ہماری جماعت کے خلاف ریمارکس نہیں کئے تھے؟ اگر کئے تھے تو اس قسم کے مجسٹریٹوں کو روکنے کا کوئی ذریعہ بھی تو ہونا چاہئے اور اگر کوئی ذریعہ نہیں ہوگا تو وہ ایسے ریمارک کرتے جائیں گے اور جماعت حقِ دفاع سے محروم رہے گی۔ چنانچہ مسٹر کھوسلہ نے ہی ہماری جماعت کے خلاف سخت ریمارکس کئے اور جب اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی تو ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ بعض جگہ مسٹر کھوسلہ مسل سے بالکل باہر چلے گئے ہیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ فاضل جج نے اس وقت کہا یا شاید فیصلہ میں لکھا کہ اسے پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ مولوی عطاء اللہ صاحب کے خلاف نہیں بلکہ جماعت احمدیہ کے خلاف ہو رہا تھا۔ مگر باوجود اس کے گورنمنٹ نے ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قانون ایسا موجود نہیں جو مجسٹریٹوں کو ایسی غیر متعلق باتوں سے روکتا ہو اور یہ صرف مسٹر کھوسلہ پر ہی منحصر نہیں اور بھی کئی مجسٹریٹوں نے پچھلے چند سالوں میں یہ غلطیاں کی ہیں اور قادیان کے احمدیوں کے متعلق ناواجب ریمارکس کئے ہیں۔ ان حالات میں لازماً اِس قوم کو غصہ آئے گا جس کے خلاف مِسلوں میں مصالحہ جمع کیا جاتا ہے مگر اسے دفاع کا موقع نہیں دیا جاتا اور وہ یا تو کسی فریق سے مل کر اپنے حق کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گی یا پھر حکومت کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ یعنی یا تو اس کا غصہ اس طرح فرو ہو سکتا ہے کہ اسے دفاع کرنے کا موقع مل جائے جس کا طریق سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ کسی ایک فریق سے مل جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس کے دل میں حکومت کے خلاف غصہ کے جذبات پیدا ہونگے کہ اس نے عدالتیں تو بنائیں مگر وہ ایک تیسرے فریق پر جس کا مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مدعی ہوتا ہے نہ مدعا علیہ ہوتا ہے بِلا وجہ حملے شروع کر دیتی ہے اور وہ قانون کو نہیں بدلتی۔ پس چاہئے کہ حکومت قانون کے ذریعہ سے جلد اس نقص کا ازالہ کرے۔ تا مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذاہب کی حفاظت کے لئے خواہ مخواہ مجرم کے ساتھ تعاون نہ کرنا پڑے اور فردی جُرم قومی کشمکشوں کا ذریعہ نہ بن جایا کرے۔ اگر وہ ایسا کر دے تو بَیْنَ الاَقوامی جھگڑوں

کی بہت سی سختی دور ہو جائے گی۔

غرض یہ صورتِ حالات قانون کے نقص سے پیدا ہوتی ہے یا پھر بے تعلق فریق کو بِلا وجہ ملزم گردا ننے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ پس یا تو گورنمنٹ پر الزام آتا ہے۔ یا مخالف فریق پر الزام آتا ہے جو بِلا وجہ ایک تیسرے فریق کو درمیان میں گھسیٹ لاتا ہے۔

پس ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کا کوئی حق نہ تھا کہ وہ ہم سے یہ مطالبہ کرتی اور اگر اس نے یہ مطالبہ ہم سے کیا تھا تو پھر اس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ ایسے امور کو بیچ میں نہ آنے دیتی جس سے جماعت پر حرف آتا ہو اور صرف انہی باتوں کے بیان کرنے کی اجازت دیتی جن کا اثر صرف ملزم تک رہتا لیکن اس نے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا بلکہ خود پراسیکیوشن کے بعض افسروں کی طرف سے فریق مخالف کے اثر کے ماتحت بعض ایسے امور زیر بحث لائے گئے جو اگر نہ آتے تو انصاف کے زیادہ مطابق ہوتا چنانچہ یہ سوال اٹھایا گیا کہ اس قتل کی تہہ میں سازش معلوم ہوتی ہے۔ گو سیشن جج صاحب نے اسے رد کر دیا۔

پس اس موقع پر جو غلطی ہوئی وہ حکومت کی طرف سے ہوئی ہم سے نہیں ہوئی۔ ہم نے اس کے مطالبہ کو امن میں مُمِد سمجھتے ہوئے مان لیا مگر اس نے فرض شناسی سے کام نہیں لیا اور اپنے ماتحت افسروں کو اس نے یہ ہدایت نہیں دی کہ ہم نے اس فریق سے چونکہ وعدہ لے لیا ہے کہ وہ بحیثیت جماعت ملزم کی مدد نہیں کرے گا اس لئے اب تمہیں خیال رکھنا چاہئے کہ ملزم کے علاوہ اس کی جماعت کا ذکر مخالفانہ طور پر درمیان میں نہ آئے۔

پس ہم نے جو وعدہ کیا تھا اسے کامل طور پر پورا کر دیا۔ ہاں ہمارا قصور یہ ضرور ہے کہ ہم نے حکومت کو وعدہ دیتے ہوئے خود اس سے بھی وعدہ نہ لے لیا کہ سازش کا سوال درمیان میں نہیں آئے گا ورنہ ہمیں ملزم کے ساتھ ملنے کی آزادی ہوگی۔ یہ ہماری ناتجربہ کاری تھی کہ ہم نے اپنے وعدہ کے مقابلہ میں ایک وعدہ اس سے نہ لے لیا کیونکہ ایسا پہلے ہمارے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ سازش کا سوال درمیان میں اٹھا دیا جائے گا تو اسی وقت ہم کہہ دیتے کہ اگر دوسرے فریق کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ یہ قتل سازش کے نتیجہ میں ہوا ہے تو پھر ہمارا حق ہوگا کہ ہم ملزم کے ساتھ مل جائیں کیونکہ اپنی براءت پیش کرنے کا

سوائے اس کے کوئی اور طریق نہیں کہ مدعا علیہ سے ہم مل جائیں اور اس کے دفاع کے ساتھ اپنا دفاع بھی پیش کر دیں اور مدعا علیہ کا وکیل تب ہی ہماری بات سُنے گا جب اس کے موکّل کا ہمارے ساتھ تعلق ہوگا۔ یونہی وہ ہماری بات کس طرح سن سکتا ہے۔ مگر خیر یہ ایک تجربہ تھا جو اس دفعہ ہمیں حاصل ہؤا اور جس سے خدا ہمیں تو بچائے مگر دوسری قومیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور جب حکومت ان سے یہ مطالبہ کرے کہ فلاں معاملہ میں بحیثیت جماعت تم مدد مت کرو تو وہ کہہ سکتی ہیں کہ بہت اچھا ہم مدد تو نہیں کریں گی مگر ساتھ ہی آپ کا بھی یہ اخلاقی فرض ہوگا کہ بات صرف مجرم تک رہے اور ایسے لوگوں کا نام لینے کا افسر ہرگز مجاز نہ ہوں جو فریقِ مقدمہ نہیں اور اگر وہ لیں تو حکومت کی طرف سے انہیں سزا دی جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر دفاع کے سامان کس طرح مہیا ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب میاں عزیز احمد صاحب کے ہم وطنوں کو جو کافی تعداد میں قادیان میں ہیں یہ معلوم ہؤا کہ جماعت بحیثیت جماعت اب ان کی مدد نہیں کرے گی تو ان میں سے بعض مجھ سے ملے اور اس امر کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ ملزم کو بغیر امداد کے چھوڑنا جائز نہیں۔ جب میں نے انہیں کہا کہ ملزم نے حملہ خود تسلیم کیا ہے۔ اس صورت میں ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں تو اس پر بعض نے کہا کہ بے شک ملزم نے حملہ تسلیم کیا ہے لیکن ہر حملہ کی سزا تو نہیں ہوتی۔ بعض حملوں کی سزا عبور دریائے شور ہوتی ہے، بعض حملوں کی سزا دس سال قید ہوتی ہے اور بعض حملوں کی سزا پھانسی ہوتی ہے اس صورت میں کیا اگر اس کا جُرم پھانسی کے قابل نہیں بلکہ قید کے قابل ہے تو ہمارا حق نہیں کہ اس کو دفاع میں مدد دیں تا وہ اپنا حق حاصل کرے اور اسے اپنے جُرم سے زیادہ سزا نہ ملے۔ آخر جُرم کے ثابت ہونے سے پہلے اس کے جُرم کی نوعیت کیونکر معلوم ہوگئی۔ اور کیا اگر اس کا جُرم دس سال قید کی سزا والا ہے تو ہمارا فرض نہیں کہ اس کو دفاع میں مدد دیں تا غلطی سے مجسٹریٹ اسے پھانسی کی سزا نہ دے دے۔ یہ تو مجرم کی نہیں بلکہ حق کی مدد ہوگی اگر اس قسم کی کوشش کی جائے۔

پس انہوں نے یہ سوال کیا کہ کیا ہمارا حق نہیں کہ ہم دفاع میں اس کی جائز حد تک مدد کریں تا اسے جُرم سے زیادہ سزا نہ ملے۔ آخر جُرم کے ثابت ہونے سے پہلے ہمیں جُرم کی

نوعیت کیونکر معلوم ہوگئی اور ہمیں کیونکر پتہ لگ گیا کہ یہ جُرم اس قسم کا ہے جس کی سزا پھانسی ہے۔ یا اس قسم کا ہے جس کی سزا عبور دریائے شور ہے۔ یا اس قسم کا ہے جس کی سزا دس سال قید ہے۔ یہ جرح ان کی معقول تھی۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ ہم یہ وعدہ کر چکے ہیں کہ بحیثیت جماعت ان کی مدد نہ کریں گے۔ آپ لوگوں کو انفرادی طور پر امداد کی اجازت دینا میرے نزدیک اس وعدہ سے باہر ہے لیکن بہتر ہوگا کہ ہم حکومت کا خیال معلوم کرلیں کہ وہ ہمارے وعدہ کے کیا معنی لیتی ہے۔ چنانچہ محکمہ امورِ عامہ کی طرف سے ڈپٹی کمشنر صاحب کو چِٹھی لکھی گئی کہ میاں عزیز احمد صاحب کے بعض ہم وطنوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہمیں اس کی مدد سے کیوں روکا جاتا ہے۔ ابھی تو اس کا جُرم ثابت ہی نہیں ہوا اور نہ جُرم کی نوعیت کا علم ہوا ہے تو جس حد تک اس کی مدد کرنے کا ہمیں اور قانون سے فائدہ اٹھانے کا انہیں حق حاصل ہے اس سے ہمیں اور انہیں کیوں محروم کیا جاتا ہے۔ اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے ہمیں تحریری جواب دیا کہ کسی ملزم کو دفاع سے ہم محروم نہیں کرنا چاہتے۔

جماعت اگر بحیثیت جماعت مدد نہ کرے اور انفرادی طور پر ملزم کے ہم وطن یا دوست یا تعلق والے کوئی چندہ کرنا چاہیں تو ان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں۔ چنانچہ اس چِٹھی کے مطابق جو اب تک ہمارے پاس موجود ہے انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ چندہ کریں اور جائز حد تک مدد کریں یعنی مدعی کو جھوٹ بولنے سے روکیں یہ نہ ہو کہ وہ کہہ دے کہ میں نے کوئی حملہ نہیں کیا جس پر ان لوگوں نے اس غرض سے لوگوں سے چندہ کر کے وکیل کیا۔ ان میں سے بعض لوگ مجھ سے بھی چندہ لینے کے لئے آئے تو میں نے کہا کہ میں اس میں چندہ نہیں دے سکتا بلکہ ناظروں کو بھی چندہ دینے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ ہمارا وجود سلسلہ سے ایسا وابستہ ہے کہ ایسے امور میں ہماری کوئی منفرد ذات نہیں ہوتی۔ ایک عام احمدی کی حیثیت اور ہے اور ہماری اور۔ ہم مرکز کو چلانے والے ہیں مگر ایک عام احمدی مرکز کو چلانے والا نہیں پس اس میں نہ میں نے چندہ دیا اور نہ ناظروں کو میں نے اس میں حصہ لینے یا کام کرنے کی اجازت دی۔

پس یہ جو کچھ ہوا اسی حکومت کی اجازت سے ہوا جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا تھا۔ احرار یا مصریوں سے تو ہمارا کوئی وعدہ تھا ہی نہیں پھر ہمارے قول میں اختلاف انہیں

کہاں سے نظر آ گیا ہم نے جس سے وعدہ کیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہم نے کیا وعدہ کیا ہے اور ہم بھی اپنے دلوں میں سمجھتے تھے کہ ہم نے کیا وعدہ کیا ہے چنانچہ حکومت کی چِٹھی موجود ہے جس میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ ہماری یہ مراد نہیں کہ ملزم کو دفاع سے محروم کر دیا جائے۔ جماعت اگر بحیثیت جماعت مدد نہ دے اور انفرادی طور پر ملزم کے ہم وطن یا دوست وغیرہ کوئی چندہ دینا چاہیں تو ہم ان کو نہیں روک سکتے وہ بے شک چندہ کر لیں۔ پس جن سے ہم نے کہا تھا کہ ہم جماعتی طور پر کوئی مدد نہیں کریں گے۔ ان پر واضح کر کے اور ان سے پوچھ کر ہم نے میاں عزیز احمد صاحب کے دوستوں اور ہم وطنوں کو چندہ کرنے کی اجازت دی اور مزید احتیاط یہ کی کہ نہ خود چندہ دیا نہ ناظروں کو دینے دیا تو یہ تیسرا فریق اعتراض کرنے والا کون ہے۔ نہ جس سے ہمارا کوئی وعدہ تھا اور نہ اسے ہمارے وعدہ کی حقیقت معلوم ہے۔ پنجابی مثل ہے تُو کون؟ میں خواہ مخواہ۔ یہی مثال احراراور مصریوں پر چسپاں ہوتی ہے۔ ہم ان سے کب کہنے گئے تھے کہ ہم میاں عزیز احمد صاحب کی مدد نہیں کریں گے۔ اگر اعتراض ہوسکتا ہے تو حکومت کو۔ اور اس حکومت کا اجازت نامہ ہمارے پاس اس بارے میں موجود ہے۔ ان احراریوں کو تو کوئی حق ہی نہیں کہ وہ ایسا اعتراض کریں یہ تو ہمیشہ ایسے مواقع پر قومی طور پر ملزموں بلکہ مجرموں تک کی امداد کیا کرتے ہیں۔ پس اس معاملہ میں احرار کا کوئی حق نہیں کہ وہ دخل دیں۔ یہ ہمارا اور گورنمنٹ کا ایک باہمی معاملہ تھا گورنمنٹ نے ہم سے ایک خواہش کی اور ہم نے اسے تسلیم کر لیا اور گو ہم سے اس کے مطالبہ کو تسلیم کرنے میں غلطی ہوئی مگر خیر ہم بھول گئے اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ گورنمنٹ کے اس افسر نے جس نے ہم سے یہ مطالبہ کیا تھا ہم سے دھوکا کیا۔ اس نے بھی نیک نیتی سے یہ مطالبہ کیا گو افسوس ہے کہ بعد میں حکومت کے بعض لوکل نمائندوں کی طرف سے فرض شناسی میں کوتاہی ہوئی۔

مگر بہر حال جس نے وعدہ کیا تھا اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا۔ جس بات پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ اسی افسر سے پوچھ کر کی گئی جس نے وعدہ لیا تھا۔ اب یہ درمیان میں دخل دینے والا تیسرا فریق کون ہے۔ اس کو تو ہم منہ لگانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے اگر اعتراض ہوسکتا تھا تو حکومت کو مگر اس نے نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں کیا بلکہ تحریری طور پر لکھا کہ ہمارا ہرگز یہ منشاء نہیں

کہ ملزم کو دفاع سے محروم کیا جائے۔ اس صورت حالات میں احرار کا جو ہمیشہ ملزموں بلکہ مجرموں کی بھی قومی طور پر امداد کیا کرتے ہیں کوئی حق نہیں کہ وہ ہم پر اعتراض کریں۔

میں اس موقع پر جماعت کے اندرونی جھگڑوں کے بارہ میں بھی کچھ راہنمائی کر دینا چاہتا ہوں۔ ہماری جماعت کی طرف سے بھی بعض دفعہ ایسے لوگوں پر اظہار ناراضگی ہوتا ہے جو ملزموں کا ساتھ دیتے ہیں اور ایسے موقعوں پر چونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ کے مسلّمہ اصل کے مطابق ملزم کی مدد کرنا جائز ہے تو ہم پر اظہار ناراضگی کی کیا وجہ ہے اور چونکہ یہ کسی قدر باریک سوال ہے اور چونکہ میری اصل غرض اس مضمون کو بیان کرنے سے یہ ہے کہ اصولی طور پر بعض مسائل حل کر دوں اس لئے اس امر پر بھی میں کچھ روشنی ڈال دینا چاہتا ہوں کہ یہ امر اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ جب کبھی مرکز کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے اور مرکز سے مراد میں خود ہوں یا وہ لوگ ہیں جو میرے کہنے پر ناراض ہوتے ہیں۔ (ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک ناظر کسی پر بذاتِ خود ناراض ہو اور غلط طور پر ناراض ہو یا ایک ماتحت افسر کسی پر ناراض ہو اور غلط طور پر ناراض ہو اور انہیں وہ مسئلہ معلوم نہ ہو جو میں بتانا چاہتا ہوں) تو یہ ملزم کے دفاع یا امداد کی وجہ سے اظہار ناراضگی نہیں ہوتا بلکہ غلط امداد یا غلط دفاع کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس میں جب بھی ناراض ہوتا ہوں یا میرے کہنے کی وجہ سے ناظر ناراض ہوتے ہیں تو ملزم کے دفاع یا اس کی امداد کرنے کی وجہ سے ناراض نہیں ہوتے ہم کبھی اس وجہ سے ناراض نہیں ہوتے کہ ملزم کی طرف سے دفاع کیوں نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہم کبھی اس وجہ سے ناراض نہیں ہوتے کہ ملزم کی امداد کیوں کی گئی ہے بلکہ ہم جب بھی ناراض ہوں گے اس وجہ سے ہونگے کہ ہمارے خیال میں ملزم کی غلط امداد یا اس کی طرف سے غلط دفاع کیا گیا ہوگا لیکن جب غلط دفاع نہ ہو یا امداد نہ ہو تو ہم کبھی ناراض نہیں ہوتے۔ پس ہم کسی پر ناراض نہیں ہوتے بلکہ کسی پر اس امر کی وجہ سے ناراض ہو نہیں سکتے کہ کیوں کسی ملزم کو مجرم ثابت نہیں ہونے دیا جاتا اور یہ تو بڑے اندھیر کی بات ہے کہ ایک شخص پر الزام لگے اور اسے فوراً مجرم قرار دے دیا جائے بلکہ ناراضگی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ کیوں کسی مجرم کو مجرم ثابت نہیں ہونے دیا جاتا یعنی یہ جانتے ہوئے کہ وہ مجرم ہے جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ وہ مجرم نہیں۔ ان پر ہم ناراض ہوتے ہیں کیونکہ ہم کہتے ہیں

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم چاہتے ہو کہ دنیا میں جھوٹ پھیلے مثلاً میاں عزیز احمد صاحب کے مقدمہ میں اگر ہم کوئی وعدہ نہ کرتے اور ان کی مدد کرتے تو گو ہمارے لئے جائز ہوتا کہ ثابت کرتے کہ واقعہ ایسا نہیں کہ اس پر پھانسی کی سزا ملے لیکن یہ جائز نہ ہوتا کہ ہم ملزم سے یہ کہلواتے کہ اس نے کوئی حملہ ہی نہیں کیا۔ یا یہ کہ اس دن وہ قادیان میں تھا ہی نہیں۔ اگر ہم ایسا کہتے تو ہم دنیا کے بھی مجرم ہوتے اور اپنے نفس کے بھی مجرم ہوتے اور خدا تعالیٰ کے بھی مجرم ہوتے۔ جب ایک واقعہ ہؤا ہے تو دیانتداری سے سزا کی نوعیت میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر حملے میں اختلاف کرنا جھوٹ اور فریب ہوگا۔

پس جس چیز میں ہم اختلاف کر سکتے تھے وہ یہ تھا کہ حملہ کی نوعیت پھانسی والی تھی یا عبور دریائے شور والی یا دس سال قید والی۔ کیونکہ قتل کے بارہ میں یہ اختلاف ہؤا ہی کرتے ہیں اور قتلوں میں سے کسی قتل کی سزا پھانسی ہوتی ہے، کسی کی عبور دریائے شور ہوتی ہے اور کسی کی دس سال قید ہوتی ہے۔ پس ہم جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اسی وقت جبکہ اس کی نوعیت کی نسبت ثابت ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ کے ساتھ امداد کر رہا ہے یا جھوٹ بلوا رہا ہے۔ یا سلسلہ کے وہ کارکن جو اس کے دوست یا رشتہ داروں کے خلاف کارروائی کرتے ہیں انہیں بدنام کرتا ہے لیکن جو سچ سمجھ کر اور سچ کے ساتھ امداد کرے جب تک اس کے رشتہ دار یا دوست کے خلاف فیصلہ نہ ہو جائے ہم اسے حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ایک شخص کے بیٹے کے خلاف اگر سلسلہ کے محکمہ قضاء میں مقدمہ چلتا ہے اور اس کا باپ دیانتداری سے سمجھتا ہے کہ اس کا بیٹا مجرم نہیں تو میں اسے انتہائی سنگ دل اور شقی القلب سمجھوں گا اگر وہ اپنے بیٹے کی مدد نہ کرے لیکن فیصلہ ہونے کے بعد ہم اس کا فرض سمجھتے ہیں کہ فیصلے کے خلاف منہ سے کچھ نہ کہے اور قاضی پر الزام نہ لگائے کہ اس نے بددیانتی کی۔ اگر وہ خود یا اس کا بیٹا دیانتدار ہے تو سلسلہ کے کارکنوں کے متعلق وہ کیوں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بھی دیانتداری سے کام کر رہے ہیں۔

پس اسے یہ تو حق حاصل ہے کہ جب تک اس کے خلاف فیصلہ نہیں ہوتا ملزم کی مدد کرے مگر اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غلط امداد یا غلط دفاع کرے۔ مثلاً اسے یہ تو حق حاصل ہے کہ وہ سچائی سے کام لے مگر اسے یہ حق حاصل نہیں کہ مقدمے میں جھوٹ بلوانے کی کوشش کرے

جیسے گزشتہ سے پیوستہ سال جب ایک لڑکے نے چوری کی اور اس پر فتنہ اٹھا تو اُس وقت اس چور لڑکے کے رشتہ داروں کے خلاف ہمیں یہ غصہ نہیں تھا کہ وہ اس کی مدد کیوں کرتے ہیں بلکہ ہم ان پر اس لئے ناراض تھے کہ ان میں سے بعض اس سے جھوٹ بُلوانا چاہتے تھے حالانکہ ہمارے سامنے وہ چوری کا اقرار کر چکا تھا۔ تو جس چیز کو ایک لحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا وہ جھوٹ اور فریب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو سچائی اور دیانت سے ہر شخص کو ملزم کی امداد کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہاں فیصلہ ہو جانے کے بعد ہم اس کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ فیصلہ کے خلاف منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالے اور قاضی پر کوئی الزام نہ لگائے۔ البتہ اسے یہ حق ہے کہ قضاء کے ذریعہ سے قاضی کے فیصلہ کو غلط ثابت کرے یا اگر قاضی کی بددیانتی ثابت ہو تو اس کے خلاف باقاعدہ دعویٰ کرے مگر یہ حق نہیں کہ پبلک میں اس کے خلاف شور مچاتا پھرے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک عورت سال بھر ہمارے گھر میں آتی رہی اور بار بار مجھ سے کہتی کہ میرے مقدمہ کا قضاء والے فیصلہ نہیں کرتے۔ میں نے کئی دفعہ دفتر والوں کو توجہ دلائی اور وہ ہمیشہ مجھے یہ لکھیں کہ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے مگر جب اس عورت سے ذکر کیا جاتا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے مقدمہ کا فیصلہ کر دیا ہے تو وہ کہتی کہ بالکل جھوٹ ہے۔ کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ آخر جب متواتر اس نے یہی کہا کہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور دفتر والے جھوٹ بولتے ہیں تو اس وقت میں نے سمجھا کہ اب یہ اختلاف اس قدر واضح ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اور کوئی کہے کہ ابھی رات ہے۔ چنانچہ میں نے دفتر سے مِسل منگوائی۔ جب مِسل آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہر جھگڑے کا فیصلہ اس میں موجود ہے۔ میں اس وقت حیران رہ گیا کہ یہ عورت سال بھر مجھ سے اتنا جھوٹ بولتی رہی حالانکہ اس کی کوئی بات نہیں تھی جس کا دفتر والوں نے کوئی فیصلہ نہ کیا ہوا ہو۔ پھر ایک دن وہ آئی تو میں نے اسے کہا۔ میں نے مسل منگوا کر دیکھی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک دیکھی ہے اس پر تمہارے مقدمہ کا فیصلہ ہر مرحلہ پر فیصلہ ہو چکا ہے اور تم کہتی ہو کہ دفتر والوں نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ بھی کوئی فیصلے ہیں یہ تو میرے خلاف ہیں۔ مَیں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے چونکہ یہ فیصلے تمہارے خلاف ہیں اس لئے تمہارے نزدیک یہ کوئی فیصلے ہی نہیں ہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس وقت بھی وہ اپنی ذہنیت کے لحاظ سے

جھوٹ نہیں بول رہی تھی کیونکہ وہ خیال کرتی تھی کہ فیصلہ وہ ہوتا ہے جو منشاء کے مطابق ہو، جو منشاء کے مطابق نہ ہو وہ فیصلہ نہیں ہوتا۔ غرض یہ طریق جائز نہیں کہ باہر دکانوں پر بیٹھ کر یا گلی کوچہ میں کھڑے ہو کر قاضیوں پر نکتہ چینی شروع کر دی جائے۔ ہاں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ ہر فریقِ مقدمہ کو حق حاصل ہے کہ وہ قاضی کے فیصلہ کے خلاف اپیل کرے اور اس پر ہم کبھی ناراض نہیں ہوتے۔ البتہ اگر وہ یہ لکھے کہ قاضی جھوٹا اور فریبی ہے تو ہم وہ مِسل واپس کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ الفاظ کاٹو گے نہیں اُس وقت تک ہم اس اپیل پر غور نہیں کریں گے کیونکہ ہم جماعت کے اندر یہ معیارِ اخلاق قائم کرنا چاہتے ہیں کہ جب کسی کے خلاف کوئی فیصلہ ہو تو وہ اسے بد دیانتی پر محمول نہ کرے۔

پس ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی شخص قاضیوں کے خلاف لوگوں میں شور مچاتا پھرے ہاں یہ جائز ہے کہ وہ اپیل کرے اور ہم نے کئی دفعہ اپیلوں میں قاضیوں کے خلاف سخت ریمارکس کئے ہیں مگر یہ میرا یا دوسری عدالت ہائے مرافعہ کا حق ہے کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔

پس آج میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ایسے موقع پر بعض دفعہ جماعت کی طرف سے جو اظہارِ ناراضگی ہوتا ہے وہ ملزموں کا ساتھ دینے کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ ہم کسی ملزم کی امداد کرنا ہرگز ناجائز نہیں سمجھتے بلکہ اگر کوئی شخص اس ڈر کے مارے کہ اگر میں نے ملزم کی مدد کی تو لوگ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اس کی جائز امداد بھی نہیں کرتا تو میں اسے شقی القلب اور ناقص مؤمن کہوں گا۔

ہاں اگر ایک باپ اپنے بیٹے کو مجرم سمجھ کر اس کی مدد سے دستکش ہو جاتا ہے تو وہ واقع میں مؤمن ہے مگر جو جُرم کے ثابت ہوئے بغیر جائز دفاع اور جائز مدد سے بھی اسے محروم کر دیتا ہے وہ شقی القلب ہے اور ہرگز کامل مؤمن نہیں۔ غرض ہم جس بات پر ناراض ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ جھوٹ کے ساتھ ملزم کی مدد کی جائے۔ یہ امر ہمارے لئے قطعاً قابلِ برداشت نہیں ہے۔ میں نے اس امر کو تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ ہمارے اندر بھی سلسلہ کی قضاء کے بارہ میں غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ملزم کی امداد کو غداری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ذرا امورِ عامہ کسی کے خلاف نوٹس لے تو بعض حلقوں میں اس کی امداد کرنے والوں کو بلا دریغ غدار

قرار دے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ صرف یہی ایسا نہیں بلکہ اس کا باپ اور اس کے بھائی بھی سلسلہ کے غدار ہیں کیونکہ وہ اس کی مدد کرتے ہیں حالانکہ امور عامہ بھی ابتداء میں الزام لگاتا ہے اور جب تک وہ الزام پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ جاتا اُس وقت تک ملزم ہرگز مجرم نہیں بن سکتا اور نہ اس کی مدد کرنے والا غدار کہلا سکتا ہے۔ جب شریعت ملزم کی مدد کو غداری قرار نہیں دیتی تو کسی اور کا کیا حق ہے کہ اسے غداری قرار دے دے۔ اس کے مقابلہ میں بعض لوگ اس پر چِڑتے ہیں کہ انہیں جائز وناجائز وسائل سے ملزم کی امداد کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ یہ دونوں غلطی پر ہیں ملزم کی جائز امداد ہرگز غداری نہیں۔ اگر امور عامہ کی ہر بات درست ہو تو پھر قضاء کا دروازہ شریعت نے کیوں کھولا ہے۔ قضاء کے محکمہ کا قیام شریعت کی طرف سے اسی لئے کیا گیا ہے کہ جب تک قاضی کوئی فیصلہ نہ کر دے شریعت ملزم کو مجرم قرار نہیں دیتی اور جب شریعت اسے مجرم نہیں سمجھتی تو اس کی امداد کرنا غداری کس طرح ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اسے جُرم کا ذاتی علم ہو۔ مثلاً اگر کسی کو ذاتی طور پر علم ہو کہ فلاں نے چوری کی ہے اور پھر وہ اس کی مدد کرتا ہے تو وہ مجرم ہے لیکن ملزم کی امداد جس کا جُرم قضاء یا علماً ثابت نہیں بہرصورت جائز ہے۔ پھر جو لوگ اس بات پر چِڑتے ہیں کہ انہیں جائز وناجائز وسائل سے ملزم کی امداد کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے وہ بھی غلطی پر ہیں کیونکہ ناجائز امداد ہرگز قابلِ برداشت نہیں جس طرح اوّل الذکر کو غدار کہنا غلط ہے اسی طرح ثانی الذکر کو محض ملزم کی امداد کرنے والا بھی کہنا دھوکا ہے۔

اس سوال کا جواب میں نے تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے تا جماعت کی بعض اصول میں راہنمائی ہو جائے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اصل اعتراض کا جواب بہت مختصر ہے۔

اصل اعتراض صرف یہ ہے کہ ایک غریب آدمی ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل تک کس طرح پہنچ سکتا تھا۔ ضرور ہے کہ جماعت نے اس کی مدد کی ہو۔ اس کا اصولی جواب تو وہی ہے کہ جو میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ اعتراض محض ناواقفیت کا نتیجہ ہے کیونکہ قانون ملزم کی امداد کرنے سے نہیں روکتا۔ دوسرا جواب واقعات کی بناء پر ہے کہ یہ اعتراض محض واقعات سے بے خبری کے سبب سے ہے۔ ہم نے نہ ہائی کورٹ میں نہ پریوی کونسل میں روپیہ خرچ کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قانونِ انگریزی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر کوئی ملزم نہایت غریب ہو اور وہ خود یا اس کے رشتہ دار یہ طاقت نہ رکھتے ہوں کہ مقدمہ لڑسکیں اور جُرم سنگین ہو تو ملزم کو سرکاری وکیل مہیا کیا جاتا ہے اور سرکار اپنے خرچ پر وہ مقدمہ لڑتی ہے۔

چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ہائی کورٹ میں شیخ بشیر احمد صاحب کو حکومت نے خود فیس دے کر کھڑا کیا اور پریوی کونسل میں بھی گورنمنٹ کی طرف سے وکیل مقرر ہوا۔ پس یہ کہنا کہ ایک غریب آدمی ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل تک کس طرح پہنچ گیا۔ یہ ہم پر اعتراض نہیں بلکہ اپنے علم پر اعتراض ہے اور اس امر کا اظہار ہے کہ اپنے ملکی قانون کو بھی وہ نہیں جانتے جس نے یہ دستور مقرر کر رکھا ہے کہ جب کسی ملزم کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ غریب ہے تو گورنمنٹ خود روپیہ دے کر اس کی طرف سے وکیل کھڑا کر دے اور ملزم کو پوری طرح اپنی بریت پیش کرنے کا موقع دے چنانچہ سرکاری طور پر ہمیشہ ایک لسٹ ایسے وکلاء کی تیار رہتی ہے اور ان کی فیسیں بھی اس کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں ۔ جب کوئی ایسا غریب شخص ملزم ہو جو مقدمہ چلانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس وقت ان وکلاء میں سے کسی ایک کو کہہ دیا جاتا ہے کہ تم اس ملزم کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کرو اور فیس ہم سے لو۔ جب اس مقدمے کا پہلی دفعہ فیصلہ ہوا ہے تو چونکہ افسروں کو علم تھا کہ لوگوں سے چندہ جمع کر کے اس مقدمہ کے اخراجات پورے کئے گئے ہیں اس لئے جیل خانے والوں نے میاں عزیز احمد صاحب سے پوچھا کہ تم اپیل کرنا چاہتے ہو یا نہیں ۔انہوں نے کہا کہ اب تک اس مقدمہ پر جتنا روپیہ خرچ ہوا ہے یہ بھی بعض دوستوں نے میرے ہم وطنوں اور تعلق رکھنے والوں سے چندہ کے طور پر جمع کیا تھا اور اب تو وہ روپیہ بھی خرچ ہو چکا ہے اور میرے پاس ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے لئے کوئی خرچ نہیں ۔انہوں نے کہا۔تم حکومت کو ایک درخواست دو جس میں لکھو کہ میں غریب آدمی ہوں اور میرے پاس مقدمہ چلانے کے لئے کوئی روپیہ نہیں میری مدد کی جائے اور میری اپیل کے لئے اخراجات کا انتظام فرمایا جاوے ہم اس پر تحقیقات کریں گے اور اگر کسی واقعہ میں ثابت ہو گیا کہ تم غریب آدمی ہو اور مقدمہ چلانے کے لئے تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے تو حکومت اپنے پاس سے ان اخراجات کا انتظام کر دے گی۔

چنانچہ انہوں نے درخواست دے دی۔ سرکار نے یہ معلوم کر کے کہ واقع میں یہ غریب آدمی ہے اور اپنے مقدمہ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا سرکاری وکیل کی امداد کا فیصلہ کیا اور چونکہ ملزم کی طرف سے خواہش تھی کہ اس کی جماعت کا وکیل ہو اور بہتر ہو تو شیخ بشیر احمد صاحب ہوں جن پر میں زیادہ اعتبار کرسکتا ہوں ہائی کورٹ نے مقدمہ شیخ بشیر احمد صاحب کے سپرد کر دیا اور خود انہیں فیس ادا کی۔ چنانچہ شیخ بشیر احمد صاحب ہائی کورٹ کے حکم سے سرکاری روپیہ پر اس کی طرف سے پیش ہوئے۔ اسی طرح جب ہائی کورٹ میں بھی فیصلہ ہو گیا تو اب صرف پریوی کونسل کا مرحلہ باقی تھا۔ حکومت کے افسروں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنا کیس پریوی کونسل تک لے جانا چاہتے ہیں انہوں نے پہلے تو کہا کہ نہیں مگر بعد میں کہہ دیا کہ ہاں میں لے جانا چاہتا ہوں۔ گورنمنٹ نے یہ قانون بنایا ہوا ہے کہ اگر کسی کی (غالباً) چالیس پاؤنڈ سے کم جائداد ہو تو اس کی اپیل حکومت خود کرتی ہے اور چونکہ ملزم کی اس قدر جائداد نہ تھی حکومت نے خود ہی ان کی طرف سے پریوی کونسل میں اپیل کی۔ آپ ہی وہاں کا غذات بھیجے اور آپ ہی وہاں مقدمہ لڑا۔ پس جو اصل اعتراض ہے۔ کہ میاں عزیز احمد صاحب جیسا غریب آدمی ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل تک کس طرح پہنچا تو اس کا نہایت مختصر مگر حقیقت پر مبنی جواب یہ ہے کہ وہ غریب آدمی سرکار کے کندھوں پر چڑھ کر پہنچا۔ کہتے ہیں ایک پاؤں کٹا شخص تھا۔ اس پر ایک دفعہ یہ الزام لگا کہ اس نے باغ کے پھل چُرا لئے ہیں۔ اب باغ کے اِردگرد بڑی بھاری دیوار تھی اور بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک پاؤں کٹا شخص اس دیوار پر کیسے چڑھ گیا اور اس نے درختوں پر سے پھل کس طرح اُتار لئے مگر سوائے اس کے اور کوئی مجرم ملتا بھی نہیں تھا۔

آخر ایک ہوشیار افسر آیا اور اس نے اس اپاہج کے ساتھ ایک اندھے شخص کو بھی دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی اس پر تمام معاملہ کُھل گیا اور وہ کہنے لگا اب میں بتاتا ہوں کہ اس نے باغ سے پھل کس طرح چُرایا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ اپاہج شخص اس اندھے کی کمر پر چڑھا اور پھر وہاں سے دیوار پر چڑھ کر اس نے پھل توڑ لیا۔ اسی طرح بے شک میاں عزیز احمد صاحب پریوی کونسل تک پہنچے مگر حکومت کے پَروں پر سوار ہو کر اور اگر یہ ناجائز ہے اور اس طرح پریوی کونسل تک

اپنے مقدمہ کو لے جانا قابلِ اعتراض عمل ہے تو احرار کو چاہئے کہ وہ کسی غریب مسلمان ملزم کی طرف سے گورنمنٹ کو اپنا وکیل مقرر کرنے نہ دیں اور اگر کرے تو اس کے خلاف سخت شور مچائیں۔اس کے بعد ان کا حق ہوگا کہ وہ ہم پر اعتراض کریں مگر اس سے پہلے ان کا اعتراض کرنا محض حماقت اور نادانی ہے۔'' (الفضل ۱۶؍ جولائی ۱۹۳۸ء)